26

خدا تعالیٰ کے وعدے تبھی پورے ہوں گے جبکہ تم بھی انہیں پورا کرنے کی کوشش کرو

(فرمودہ 27 راگست 1948ء بمقام کوئٹہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ [1] کہ اے مسلمانو! تم جہاں سے بھی نکلو تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ اس آیت کے مفسرین یہ معنے کرتے ہیں کہ اس میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ اِس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے اور خواہ مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے۔ جب یہ آیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہوگی تب بھی اس کے معنی قبلہ کی طرف منہ کرنے کے نہیں ہوں گے اور اگر مسلمانوں کے متعلق یہ آیت ہوگی تب بھی اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کیونکہ اِس آیت کے لفظی معنے یہ بنتے ہیں

کہ جہاں سے بھی تم نکلو،تم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کرلو یا جہاں سے بھی تُو نکلےتُو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لے۔اب یہ تو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ چلتے وقت نماز نہیں پڑھی جا سکتی بلکہ نماز ٹھہر کر ہی پڑھی جاسکتی ہے۔ہاں اگراس آیت کے یہ الفاظ ہوتے کہ حَيْثُمَا كُنْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تم جہاں کہیں بھی ہوتم اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرلو یا تُو جہاں کہیں بھی ہوا پنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لے تب تو یہ معنے صحیح ہو سکتے تھے۔لیکن یہ تو فرمایا گیا ہے مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یامِنْ حَيْثُ خَرَجْتُمْ یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اے مسلمانو! جہاں سے بھی تم نکلوتم اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ یہاں ''خروج'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنے نکلنے کے ہیں۔اب یہ صاف بات ہے کہ نماز نکلتے وقت نہیں پڑھی جاتی بلکہ کسی جگہ ہوتے ہوئے نماز پڑھی جاتی ہے۔پس معلوم ہوا کہ یہاں نماز پڑھنے کے معنے کرنا درست نہیں۔ چونکہ چلتے وقت نماز نہیں پڑھی جاتی اس لیے اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ جب تم نماز پڑھوتو قبلہ کی طرف منہ کرلو بلکہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے مستحق اور مورِد ہیں۔ جب آپ کو مکہ سے نکالا گیا اُس وقت دشمنانِ اسلام کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ جب آپ دعائے ابراہیمی کے موعود تھے اور خانہ کعبہ کے ساتھ آپ کا تعلق تھا تو آپ کو مکہ سے کیوں نکال دیا گیا؟ جب آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا ہے تو آپ دعائے ابراہیم علیہ السلام کے کس طرح مستحق ہو سکتے ہیں؟اس اعتراض کے جواب میں فرمایامِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !تمہارا مکہ سے یہ نکلنا عارضی ہے۔ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ تمہیں موقع دیں گے اورتم مکہ پر قابض ہو جاؤ گے۔لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کے اپنے مومن بندوں سے وعدے ہوتے ہیں وہاں وہ اُن سے یہ اُمید کرتا ہے کہ وہ بھی اس وعدہ کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ اُن سے وعدہ کرلے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں اوراس وعدہ کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں اور یہ سمجھ لیں کہ جب خدا تعالیٰ نے خود وعدہ کیا ہےتو وہ اسے پورا کرے ہمیں اس کے پورا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ اسے کنعان کا ملک دیا

جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ جب وہ ملک سامنے آ گیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا جاؤ اور لڑائی کر کے اس ملک پر قبضہ کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں دینے کا وعدہ کیا ہے اس لیے وہ خود ہی اس وعدہ کو پورا کرے گا اور یہ ملک ہمارے قبضہ میں دے دے گا۔ ہم نے اگر اس ملک کو فتح کیا تو پھر وعدے کا کیا فائدہ؟ وعدہ تو خدا نے کیا ہے وہ اسے خود پورا کرے گا۔ ہمیں اس کے لیے کسی قسم کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ 2 کہ اے موسیٰ! تُو ہم سے کہا کرتا تھا کہ یہ ملک خدا تعالیٰ تمہیں دے دے گا۔ اب تمام ذمہ داری تجھ پر ہے یا تیرے خدا پر ہے۔ ہم نے اگر ملک فتح کیا تو پھر تیرے اور تیرے خدا کے وعدوں کا کیا فائدہ؟ چونکہ تُو ہمیں بتایا کرتا تھا کہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ یہ ملک ہمیں ضرور ملے گا۔ اس لیے اب تُو جا اور تیرا رب دونوں لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ جب تم ملک فتح کر کے ہمیں دے دو گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ بظاہر ان کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی کسی سے کہے کہ مَیں تمہیں فلاں چیز دوں گا اور وہ اس سے آ کر وہ چیز مانگے اور وہ اسے کہہ دے کہ جاؤ بازار سے خرید لو تو سارے لوگ یہی کہیں گے کہ اگر اُس نے وہ چیز بازار سے ہی خریدنی تھی تو پھر اُس کے وعدہ کی کیا ضرورت تھی۔ پس بظاہر یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے لیکن الٰہی سلسلوں میں یہ اول درجہ کی غیر معقول بات ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُن بنی اسرائیل کی تعریف نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ تمہیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم یہ ملک تمہیں لے کر دیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے ہماری ہتک کی ہے اس لیے تمہیں اس ملک سے محروم کیا جاتا ہے۔ جاؤ چالیس سال تک جنگلوں میں بھٹکتے پھرو۔ تم اس ملک کے وارث نہیں بن سکتے۔ تمہاری نئی نسل اس ملک کی وارث ہوگی کیونکہ تم نے ہماری ہتک کی ہے۔ تو دیکھو یہ چیز انسانی لحاظ سے تو درست اور معقول کہلا سکتی ہے لیکن الٰہی سلسلہ کے لحاظ سے نہایت ہی غیر معقول ہے اور انسان کو عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان وعدہ کرتا ہے تو اسے تغیراتِ سماوی اور تغیراتِ ارضی پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس لیے جب بھی وہ وعدہ کرتا ہے تو ایسی چیز کا کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہوتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے جو وعدہ ہوگا اُس کا یہ مطلب ہوگا کہ اگرچہ اس چیز کا حصول تمہارے

لیے ناممکن ہے مگر یہ تمہیں ہماری مدد سے مل جائے گی۔ وہ قوم فرعون کی سینکڑوں سال تک غلام رہی۔ اس کے لیے اینٹیں بناتی رہی، لکڑیاں کاٹتی رہی اور ذلیل سے ذلیل کام کرتی رہی۔ وہ اتنے بڑے اور عظیم الشان ملک پر جس پر عادقوم حکمران تھی قبضہ کیسے کرسکتی تھی۔ اسے یہ ملک مل جانا آسان نہیں تھا لیکن خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ گو یہ ملک حاصل کرنا تمہیں ناممکن نظر آتا ہے لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم یہ ملک تمہیں دیں گے اور تم یہ ملک ہماری مدد سے حاصل کرلو گے۔ پس خدا تعالیٰ کے وعدے کے یہ معنی نہیں ہوا کرتے کہ اس نے وعدہ کر دیا اس لیے بندے کو کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تم اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے تدبیر اختیار کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے وعدے اَور رنگ کے ہوتے ہیں اور بندے کے وعدے اَور رنگ کے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے وہ وعدے جن میں تدبیر شامل ہوتی ہے بندے کو اس میں دخل دینا پڑتا ہے اور اس کو پورا کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر بندہ اس میں دخل نہیں دے گا اور اس کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن بندے کے وعدے میں یہ نہیں ہوتا۔ بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں تمہارے لیے خدا تعالیٰ کی تقدیر بدل دوں گا کیونکہ وہ اس کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ تم تقدیر کو بدلنے والے کون ہو لیکن خدا تعالیٰ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو مَیں تمہاری مدد کروں گا اور اپنی تقدیر بدل دوں گا کیونکہ تقدیر ایک ایسی چیز ہے جو اس کے قبضہ میں ہے اور وہ جب چاہے اسے بدل سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ عمل کو رد نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کے وعدے میں جس میں تدبیر شامل ہو یہ پایا جاتا ہے کہ تم اگر کوشش کرو تو اگرچہ یہ بظاہر ناممکن ہے لیکن مَیں تمہاری مدد کروں گا اور تم اسے حاصل کرلو گے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کا وعدہ دیا گیا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ کہا گیا کہ اے مسلمانو! تم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا تعالیٰ نے مکہ کے دینے کا وعدہ کیا ہے وہ خود اسے پورا کرے گا۔ ہمیں اس کے لیے تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تمہیں بھی اس کے پورا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ خدائی وعدے کے یہ معنی ہیں کہ تم کمزور ہو۔ اگر تم کمزور نہ ہوتے تو تم مکہ کو چھوڑ کر کیوں آتے۔ مکہ کو چھوڑنے کے معنی ہی یہ تھے کہ تم کمزور ہو اور تمہارا دشمن مضبوط اور طاقتور ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ تمہیں طاقت دے گا اور تم دشمن سے مکہ چھین لو گے۔

پس مِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کے یہ معنے ہوئے کہ تم جہاں سے بھی نکلو یا جس جگہ سے بھی نکلو۔ تمہارا مقصد یہ ہو کہ ہم نے مکہ فتح کرنا ہے۔

پھر خروج کے معنی لشکر کشی کے بھی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ تم جہاں بھی لشکر کشی کرو۔ کسی جگہ بھی لڑائی کے لیے جاؤ۔ چاہے تم مشرق کی طرف نکلو یا جنوب کی طرف نکلو، مغرب کی طرف نکلو یا شمال کی طرف نکلو تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تمہارا یہ خروج فتح مکہ کی بنیاد قائم کرنے والا ہو۔ مثلاً تم اگر جنوب کی طرف دشمن پر حملہ کرنا چاہو لیکن تمہیں معلوم ہو جائے کہ اُس ملک کے مغرب کی طرف بھی دشمن موجود ہیں اور اُن کے متعلق یہ شبہ ہے کہ وہ کہیں پیچھے سے حملہ نہ کر دیں اور تم پہلے مغرب کی طرف حملہ کر کے اُن کو صاف کر لو تو اس کے معنے ہوں گے کہ یہ مغرب کی طرف حملہ اصل میں جنوب کے حملہ کا پیش خیمہ ہے۔ اِسی طرح اگر اس قوم کے ساتھی شمال میں بستے ہوں اور پہلے تم ان پر حملہ کرو تو...... تمہارا حملہ اصل میں جنوب پر ہی ہوگا کیونکہ اصل مقصد تمہارا جنوب کے دشمن پر حملہ کرنا ہی ہوگا۔ اسی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تم کسی قوم، کسی ملک اور کسی علاقے پر چڑھائی کرو تو اس کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ تم نے مکہ فتح کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑے کام پر قوم کی توجہ کا مرکوز کرنا ضروری ہوتا ہے اور اسی طرح افراد کو بھی بڑے کاموں کے کرتے ہوئے اپنی پوری توجہ ان کی طرف لگا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم یا فرد ایسا نہ کرے تو وہ کبھی بڑے مقصد پورے نہیں کر سکتے۔

خدا تعالیٰ نے ہماری جماعت کو ایک خاص مقصد کے لیے قائم کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو باقی تمام ادیان پر غالب کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ[3] کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ ثانیہ اس لیے فرمائی ہے تا اسلام کو باقی تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے۔ گویا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی غرض ہی یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو باقی تمام ادیان پر غالب کرنا ہے۔ یہ غلبہ ہزاروں ہزار اقسام کا ہے۔ اِس زمانہ میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس میں اسلام غالب نظر آتا ہو۔ دین کو لے لو۔ اگرچہ عیسائیت جھوٹی ہے اور اسلام ہی سچا مذہب ہے مگر پھر بھی عیسائیوں میں کئی لاکھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے دین کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔

عیسائیوں کا چھ لاکھ باقاعدہ مبلغ ہے اور یہ صرف پروٹسٹنٹ اور پرولیٹیرین (PROLETARIAN) چرچوں کا ہے۔ رومن کیتھولک ان کے علاوہ ہیں۔ سارے ملا کر قریباً بیس پچیس لاکھ پادری بن جاتے ہیں۔ اب دیکھو! انہیں صرف جھوٹا کہنے سے کیا بنے گا۔ جھوٹے کے معنے تو یہ ہیں کہ آپ کے اندر اس سے زیادہ قربانی پائی جائے لیکن حال یہ ہے کہ جو جھوٹا ہے وہ تو ایک انسان کی خدائی منوانے کے لیے لاکھوں مبلغ دیتا ہے لیکن سچا، خدا کی خدائی منوانے کے لیے سینکڑوں مبلغ بھی نہیں دیتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایسے پچاس آدمی بھی نہیں پائے جاتے۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیت کے پاس لاکھوں مبلغ ہیں جو بڑے جوش کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

افریقہ کے ایک علاقہ میں ایک دفعہ عیسائیوں کے چھ سات مشنری گئے۔ وہاں کے مردم خور آدمیوں نے انہیں کھا لیا۔ جب یورپ میں یہ خبر پہنچی تو تین چار دن میں کئی ہزار مردوں اور عورتوں نے اپنے نام پیش کر دیئے کہ ہم وہاں جانے کے لیے تیار ہیں۔ مسلمان اول تو وہاں گئے ہی نہیں لیکن اگر چلے بھی جاتے اور مردم خور انسان انہیں کھا لیتے تو جب وہاں سے خبر آتی ہماری عورتیں کہتیں شکر ہے ہمارا بچہ نہیں گیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں میں کتنا جوش ہے۔ صرف یہ کہنے سے کہ ہمارا مذہب سچا ہے اور وہ جھوٹے ہیں کیا بن جاتا ہے۔ سچا مذہب کیا کوئی جادو اور ٹونہ ہے کہ اگر اس کا نام لے لیا تو اللہ تعالیٰ ہمیں آسمان پر جگہ دے دے گا؟ سچے کی کوئی علامت ہونی چاہیے۔

پھر عیسائیت کے مقابلہ میں ہم اگر لاکھوں مبلغ بھی دیں تو وہ کون ہوں گے؟ وہ ایسے ہوں گے جن کی 25 سے 50 تک ماہوار آمدن ہوگی، جو دال روٹی کھانے والے ہوں گے۔ ان کو اگر ایک آدھ وقت کا فاقہ بھی آ گیا تو آخر کونسا فرق پڑے گا لیکن عیسائیت میں جن لوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں اُنہیں ہر قسم کی دولت میسر تھی۔ اگر مسلمان اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں تو گویا 50 روپے ماہوار خرچ کرتے ہیں لیکن اِس کے مقابلہ میں عیسائی لوگ ہزار، دو ہزار، تین ہزار روپیہ ماہوار خرچ کرتے ہیں۔ ان میں طاقت تھی کہ وہ اتنی کمائی کر سکیں لیکن اس آمدن کو چھوڑ کر وہ چلے گئے۔ ایسے ایسے ڈاکٹر جو سارے علاقے میں مشہور تھے، جو شہر میں پریکٹس کے ذریعہ چالیس چالیس، پچاس پچاس ہزار روپیہ ماہوار کما سکتے تھے گرجے میں تنگی سے اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ انہیں وہاں معمولی کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ دو تین جوڑے کپڑے پہننے کو مل جاتے ہیں اور پھر وہ اپنی ساری عمر

گرجے میں لگا دیتے ہیں۔

پنجاب میں ایک ڈاکٹر ٹیلر تھا۔ وہ آنکھوں کے علاج میں سارے پنجاب میں مشہور تھا۔ گزشتہ جنگ کے دنوں میں وہ چند دن سرکاری ہسپتال میں بھی لگا تھا۔ مَیں نے خود اُس سے علاج کروایا ہے۔ ہزاروں ہزار مریض اس کے پاس آتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کم از کم پندرہ روپیہ اسے دیتا تھا اور جو آپریشن کرواتے تھے وہ تو سو سو دو دو سو بھی دیتے تھے لیکن وہ اپنی ساری آمدن گرجے میں دے دیتا تھا اور کہتا تھا مَیں تو پادری ہوں اور مَیں نے اپنی زندگی وقف کی ہوئی ہے۔ پس اگر ہم تعداد میں بھی ان کے برابر ہوتے تب بھی ہماری قربانی ان کی قربانی کے برابر نہیں ہو سکتی تھی۔ امریکہ کے بعض پروفیسر سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو میں کام کر رہے ہیں۔ اگر انہیں گورنمنٹ منگواتی تو ہزار ہزار، ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار ماہوار دیتی۔ پس اُن کے افراد کے مقابلہ میں بھی ہم نے کوئی قربانی نہیں کی اور لیاقت کے مقابلہ میں بھی ہم نے کوئی قربانی نہیں کی۔ اور پھر یہ تو مَیں نے ہزاروں شاخوں میں سے ایک شاخ گنوائی ہے۔ اب اگر ہم کہیں لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو دنیا کے باقی ادیان پر غالب کرنا ہے۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کوئی ایسی جماعت پیدا ہو جائے جس کے افراد دوسرے مذاہب سے زیادہ دین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں۔ وہ دوسرے مذاہب سے زیادہ لیاقت کی قربانی کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اسلام دوسرے مذاہب پر غالب کیسے ہوگا۔ یا مثلاً تعلیم کو لے لو۔ تعلیم میں جتنی انہوں نے ترقی کی ہے ہمارا ان سے مقابلہ ہی کہاں ہے؟ اُن کا ادنیٰ سے ادنیٰ عالم ہمارے بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں زیادہ علم رکھتا ہے۔ گویا علم کے میدان میں بھی ہم انہیں اُس وقت تک شکست نہیں دے سکتے جب تک ایسے علماء پیدا نہ کیے جائیں جن کے سامنے یورپ کے علماء ہیچ رہ جائیں۔

پھر خدمت خلق کا کام ہے وہ ہزاروں ہزار اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں ریڈ کراس سوسائٹیاں قائم کی جا رہی ہیں، کہیں ہسپتال کھولے جا رہے ہیں اور کہیں سکول کھولے جا رہے ہیں۔ اس میدان میں بھی اگر ہم انہیں شکست نہ دیں تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہماری خدمت خلق ایسی ہونی چاہیے کہ کوئی اَور مذہب ہمارا مقابلہ نہ کر سکے۔ پس اگر قرآن کریم کی یہ پیشگوئی پوری ہو سکتی ہے تو اُسی وقت جب ہم ہر میدان میں اور ہر کام میں انہیں شکست دیں۔

پھر عیسائیوں کو جانے دو ہندوستان میں ہندوؤں کے کتنے سادھو پائے جاتے ہیں خواہ وہ مذہب جھوٹا ہی ہے مگر ان کے سادھوؤں کا کم از کم سولہ لاکھ کا اندازہ ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہندوستان میں سولہ لاکھ ہندو ایسے ہیں جو شادی بیاہ کا خیال ترک کر کے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر ننگ دھڑنگ بھوت بنے پھر رہے ہیں۔ کانگرس کو جو کامیابی ہوئی ہے اس میں بڑی مدد ان سادھوؤں کی تھی اور مجھے یاد ہے کہ جب گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ پر شورش کا فیصلہ کیا اور کہا کہ ہم نان کوآپریشن (Non-co-operation) کریں گے۔ اُس وقت تین چار دن کے اندر اندر سارے ہندوستان میں ایسی آگ لگ گئی تھی کہ حیرت آتی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ قادیان ایک طرف ہے اِس طرف کسی کی توجہ نہیں۔ انہوں نے صرف پندرہ دن پہلے اعلان کیا تھا۔ اس لیے خیال تھا کہ سب ملک میں خبر نہ پہنچی ہوگی۔ مَیں نے چاہا کہ مَیں اپنے گرد کے لوگوں کو سمجھاؤں تا فساد نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کے لوگوں کو اس تحریک کی خبر تک نہ ہوگی۔ جب مَیں نے رؤساء کو اکٹھا کرنے کے لیے آدمی بھیجے تو ان میں سے ایک آدمی نے مجھے آکر یہ بتایا کہ فلاں گاؤں کے زمینداروں کو مَیں نے بڑی مشکل سے یہاں آنے پر راضی کیا ہے۔ وہ بات سننے سے پہلے ہی کہنے لگے کہ آخر مرزا صاحب کے آباء واجداد بھی اِس علاقہ کے حاکم تھے اور اگر وہ دوبارہ حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اُن کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ ہم نے انگریزوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ قادیان کے پاس ہی تین میل کے فاصلہ پر ٹھیکری والا ایک گاؤں ہے۔ وہاں اُن دنوں کافی تعداد میں پستول پہنچ گئے تھے اور وہاں ان کی پریکٹس بھی ہوا کرتی تھی۔ مَیں نے جب اس کی تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب کام سادھوؤں کا تھا جنہوں نے تمام علاقہ میں پھر کر اور چکر لگا کر یہ خبر پہنچا دی تھی۔ ہندوستان میں آٹھ لاکھ گاؤں ہیں۔ اس طرح 16 لاکھ سادھوؤں کے یہ معنے ہوئے کہ دو دو سادھو ایک وقت میں ایک ایک گاؤں میں جا سکتے ہیں اور اس طرح ایک چیز سارے علاقہ میں ایک دن میں پھیلائی جا سکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں میں ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے اے مسلمانو! تمہارا جو مقصد ہے تمہاری ہر وقت اس کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ گزشتہ ایام میں جو کچھ ہندوؤں نے کوشش کی اُسے دیکھ لو اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہندو قوم کی تنظیم کی جائے اور ان کو ترقی دی جائے۔ اگر کوئی ہندو ایکسائز ڈیپارٹمنٹ (EXCISE DEPARTMENT)

میں ہوتا اور اس کے محکمہ میں کوئی معاملہ جاتا تو انسپکٹر سے لے کر حکومت ہند کے سیکرٹریوں اور وزیروں تک اس کی مدد کرتے۔ صرف اس لیے کہ وہ ہندو ہے وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ اس کا نام رلیا رام لکھا ہے اور سمجھ لیتے کہ اس کے مدمقابل عبدالرحمان نے ضرور غلطی کی ہے۔ مگر اس مقابلہ میں مسلمان ڈرتے تھے اور وہ خیال کر لیتے تھے کہ عبدالرحمان نے ضرور غلطی کی ہے اسے ضرور سزا ملنی چاہیے ورنہ ہندو کہیں گے کہ یہ متعصب ہے۔ ہندوؤں کے مدنظر اپنی قوم کی ترقی تھی اس لیے وہ ہر رستہ سے طاقت حاصل کر لیتے تھے اور اس لیے بڑھتے جارہے تھے۔ مسلمانوں کے مدنظر اُن کا ذاتی مفاد تھا قوم کی ترقی نہیں تھی اس لیے وہ پراگندہ ہو گئے۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ قوم کو پراگندہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے بلکہ فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تم جس طرف بھی نکلو تمہارا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہم نے خدا تعالیٰ کے دین کو کامیاب کرنا ہے۔ جب تک تم اس رنگ میں کام نہیں کرو گے تمہیں کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

صحابہؓ میں یہ چیز پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ ہر رنگ میں اس کے لیے کوشش کرتے تھے اور آخر انہیں کامیابی ہو جاتی تھی.......... فتح مکہ کی جن لوگوں نے بنیاد رکھی وہ چند صحابی تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ پر تشریف لے گئے۔ آپ نے مشرکینِ مکہ سے معاہدہ کیا۔ آپ یہی خدائی منشا سمجھتے تھے کہ حملہ کر کے مکہ میں داخل نہ ہوں۔ اس لیے آپ نے مشرکینِ مکہ سے معاہدہ کر لیا اور اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے اسے مسلمان واپس کر دیں مگر جو مسلمان مرتد ہو کر مکہ آجائے اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ صحابہؓ پر یہ بہت گراں گزرا اور انہوں نے سمجھا کہ یہ تو بڑی بھاری شکست ہو گی۔ کفار میں سے جو مسلمان ہو کر آئیں گے اسے تو ہمیں واپس کرنا ہو گا لیکن ہم میں سے جو مرتد ہو کر مکہ چلا جائے گا اُسے مشرکین مکہ واپس نہیں کریں گے۔ بعض صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت بھی کی۔ آپ نے انہیں یہ جواب دیا کہ ہمارا آدمی جہاں کہیں بھی ہو گا اسلام کی خدمت کرے گا لیکن ہم میں سے جو مرتد ہو جائے گا اور مشرکین کے پاس چلا جائے گا وہ ہمارے کس کام کا؟ ہم نے اسے کیا کرنا ہے؟ معاہدے پر ابھی دستخط نہیں ہوئے تھے کہ وہ رئیسِ مکہ جو معاہدہ کر رہا تھا اُسی کا بیٹا جسے رسیاں بندھی ہوئی تھیں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں کسی نہ کسی طرح لڑھکتا لڑھکتا وہاں پہنچا اور عرض کیا یا رسول اللہ! مَیں مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کی وجہ سے میرا یہ حال ہے۔ ان لوگوں نے مجھے قید کر رکھا ہے اور مجھے باہر نہیں نکلنے دیتے اور طرح طرح کی ایذائیں اور دکھ

دیتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر آیا تھا، صحابہؓ اس کی مدد کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن وہ رئیس جو معاہدہ کر رہا تھا اُس نے کہا معاہدہ میں یہ شرط ہے کہ مکہ میں سے جو مسلمان ہو کر آپ کے پاس جائے گا اُسے واپس کیا جائے گا۔ اگرچہ معاہدے پر ابھی دستخط نہیں ہوئے مگر فریقین کے درمیان طے تو ہو چکا ہے اس لیے یہ آدمی آپ کو واپس کرنا پڑے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں ہم معاہدہ کر چکے ہیں اور اس کے مطابق یہ واپس کیا جائے گا۔ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا اسے واپس کر دو۔ اور آپ کے حکم کے مطابق وہ واپس کر دیا گیا۔ مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا مگر آپ نے فرمایا ہم معاہدہ کر چکے ہیں ہمیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ واپس پہنچ گئے تو ایک مسلمان آپ کے پاس آیا اور اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ! مَیں مسلمان ہوں۔ کفار مجھے اس اس قسم کی ایذائیں دیتے تھے۔ مَیں بھاگ کر آیا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی آ گئے اور انہوں نے کہا معاہدہ کے مطابق یہ شخص مدینہ میں نہیں رہ سکتا اسے واپس کریں۔ ہمارا یہ معاہدہ تھا کہ ہم میں سے جو بھی مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے اسے واپس کر دیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے اور اس شخص کو واپس کر دیا۔ راستہ سے بھاگ کر وہ پھر آ گیا۔ پھر اس کے متعاقب حاضر ہوئے اور اس کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ آپ تو حوالہ کر چکے ہیں۔ اب تو مَیں ان سے بھاگ کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں تمہیں معاہدہ کی پابندی کرنی ہوگی اس لیے تمہیں واپس جانا ہی پڑے گا۔ وہ مدینہ سے واپس لَوٹا تو پھر ان سے چھُپ کر ایک جگہ پر جو شام کے قافلوں کے راستہ پر تھی جگہ بنالی اور جو قافلہ اُس رستہ سے گزرتا تھا وہ اُس پر حملہ کرتا تھا اور جتنا نقصان اسے پہنچا سکتا تھا پہنچاتا تھا۔ جب مکہ کے دوسرے مسلمانوں کو اس کی خبر ملی تو وہ بھی اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ تھوڑے دنوں میں مکہ کی تجارت بالکل تباہ ہو گئی۔ وہ چند آدمی تھے مگر مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ[ط] کے ماتحت انہوں نے اپنی جانوں کی پروا نہیں کی۔ اور یہ نہیں کیا کہ حبشہ کی طرف بھاگ جائیں وہاں انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ ایران بھاگ جائیں وہاں انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ روم بھاگ جائیں وہاں وہ امن پا سکتے تھے اور ملازمتیں وغیرہ کر سکتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس پہاڑی پر ڈیرا لگا لیا۔ کفار کے قافلوں پر حملے کیے اور ان کی طاقت کو کمزور کیا اور فتح مکہ کی بنیاد رکھ دی۔ تو دیکھو

چندافراد نے مکہ کی طاقت کوتوڑ دیا۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے رعایت کر جاتے تھے مگر وہاں تو آپ موجود نہیں تھے۔ مسلمان پوری طرح حملہ کرتے تھے اور کفار کو تباہ کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کفارِ مکہ نے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان مسلمانوں کو واپس بلا لیجیے۔ یہ لوگ تھوڑے سے تھے مگر انہوں نے مسلمانوں کا وہ رعب بٹھا دیا کہ مکہ والوں کی غیرت بالکل مٹ گئی۔ انہوں نے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان کو واپس بلا لیجیے۔سارے مکہ والے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اس طرح فتح مکہ کی بنیاد قائم ہوگئی۔اس کے بعد قبائل میں خود بخود جوش پیدا ہو گیا۔ جن کے مکہ والوں سے معاہدات تھے جب انہوں نے دیکھا کہ مکہ والے دس بارہ آدمیوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ ان سے الگ ہونے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ملنے لگے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک جیت ہی نہیں سکتی جب تک کہ وہ ہر وقت اور ہر لحہ اپنے مقصد کی طرف متوجہ نہ رہے۔جس طرح اُس زمانہ میں مسلمانوں کا یہ مقصد تھا کہ ہم نے مکہ فتح کرنا ہے اسی طرح ہر زمانہ میں، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے ایک مقصد ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگیاں صَرف نہ کر دے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اُس وقت تک کسی کامیابی کی امید رکھنا ہی غلط ہے۔

مَیں نے تمام مذاہب کی تاریخوں میں جو بھی محفوظ ہیں کہیں بھی نہیں دیکھا کہ ایک آدمی اگر تجارت کر رہا ہے تو وہ تجارت ہی کر رہا ہے اور اگر اس نے تھوڑا بہت چندہ دے دیا تو سمجھ لیا کہ اس نے دین کی بہت بڑی خدمت کر دی ہے۔مَیں نے ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایسا کیا، نہ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایسا کیا، نہ رام اور کرشن علیہما السلام کی قوموں نے ایسا کیا اور نہ زرتشت علیہ السلام کی قوم نے ایسا کیا۔غرض کسی بھی نبی کی قوم نے ایسا نہیں کیا۔سارے ہی موت کو قبول کرتے تھے۔تجارت اور پیشے کرنا ان میں حق نہیں تھا مگر وہ جو بھی کرتے تھے اپنے مقصد کی تائید کے لیے کرتے تھے۔ وہ نوکریاں اس لیے کرتے تھے تا جماعت کی ترقی کے لیے موقع مل سکے۔ وہ زراعت اور صنعت وحرفت اس لیے کرتے تھے تا جماعت کی ترقی کے لیے کوئی موقع مل سکے۔ وہ پیشے اس لیے کرتے تھے تا جماعت کی ترقی کے لیے کوئی موقع مل سکے اور وہ تجارتیں اس لیے کرتے تھے تا جماعت کی ترقی کے لیے کوئی موقع مل سکے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری جماعت میں سے بہت سے

ایسے افراد ہیں کہ اگر وہ پانچ وقت نمازیں پڑھ لیتے ہیں یا چندہ دے دیتے ہیں تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انہوں نے خدائی سپاہی کا کام پورا کر دیا ہے۔ اگر کسی ملک کے ایسے سپاہی ہوں تو وہ ایک ہی سال میں تباہ ہو جائے۔

جب بھی کوئی نبی دنیا میں آتا ہے اُس کے ماننے والے روحانی سپاہی ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس رنگ میں صَرف کریں کہ وہ اپنے مقصد کو پورا کر لیں۔ اگر وہ اپنی زندگیوں کو ایسے رنگ میں صَرف نہیں کرتے کہ ان کا مقصد پورا ہو تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیاب وہی قوم ہوگی جو اپنی زندگیوں کو اس رنگ میں لگا دے کہ وہ جب دفتر جا رہے ہوں تب بھی ان کے دماغ میں یہ ہو کہ ہم نے دین کو غالب کرنا ہے، جب دفتر سے واپس آ رہے ہوں تب بھی ان کے دماغ میں یہ ہو کہ ہم نے دین کو غالب کرنا ہے۔ وہ جب تجارت کر رہے ہوں اور ترازو اُن کے ہاتھ میں ہو تب بھی ان کے دماغ میں یہ ہو کہ ہم نے دین کو غالب کرنا ہے۔ وہ اگر ہل چلا رہے ہوں اُن کا ہاتھ ہل پر ہو مگر اُن کا دماغ اِس طرف جا رہا ہو کہ ہم نے دین کو غالب کرنا ہے۔ جب تک آپ لوگوں میں یہ روح پیدا نہیں ہو جاتی اُس وقت تک کامیابی کی امید رکھنا غلط ہے۔ مَیں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ سلسلہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قائم کیا ہوا ہے کامیاب نہیں ہوگا۔ یہ سلسلہ ضرور کامیاب ہوگا خواہ آپ سب مرتد ہو جائیں۔ مگر بے شرمی یہ ہے کہ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مَیں اس کامیابی میں حصہ دار ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب مسلمانوں کے افراد مدینہ سے باہر نکلتے تھے تو منافق کہتے تھے کہ یہ اپنی جانوں کو ضائع کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ مگر جب وہی لشکر فاتح ہو کر واپس آتے تو وہ مدینہ سے باہر نکل آتے اور لشکر کے ساتھ مل جاتے اور کہتے ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ایسی بیہودگی پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔ پس یہ سوال نہیں کہ یہ سلسلہ کامیاب ہوگا یا نہیں؟ یہ سلسلہ یقیناً کامیاب ہوگا۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ کمزور ایمان اور منافق لوگ بھی ان نعمتوں میں اپنے آپ کو شریک سمجھتے ہیں۔ وہ نوکریاں کرتے ہیں، تجارتیں کرتے ہیں، پیشے کرتے ہیں اور دنیا کے دیگر کاروبار کرتے ہیں مگر اسلام کو ان پر حاوی اور غالب نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس مقصدِ عالی میں شریک ہو گئے ہیں جس کے لیے خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا ہے۔

مَیں کوئٹہ کی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں اور اس جماعت کے ذریعہ دوسری جماعتوں کو بھی

نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میں طاقت ہے مگر وہ ہر کام نہیں کیا کرتا۔ کیا اُس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کوئٹہ کو اُٹھا کر اُلٹ دے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ کیا اُس میں یہ طاقت نہیں کہ تمام عیسائی مر جائیں؟ کیا اُس میں یہ طاقت نہیں کہ تمام عیسائی ایک دن اپنے خزانے کھولیں اور وہ سب خزانے احمدیوں کے گھروں میں پڑے ہوں اور وہ خود قلاش ہو جائیں۔ مگر کیا خدا تعالیٰ ایسا کرتا ہے؟ یہ کہہ دینا کہ وہ ایسا کردے گا حماقت کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو کس رنگ میں استعمال کرتا ہے۔ اُس میں یہ طاقت ہے کہ وہ دس بیس سال میں تمہیں دس کروڑ کردے۔ یہ اس کے لیے ناممکن نہیں مگر کیا وہ ایسا کرتا ہے؟ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ مُردوں کو پھر زندہ کردے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں واپس لے آئے، حضرت موسٰی وعیسٰی علیہما السلام کو دوبارہ لے آئے۔ مگر کیا وہ ایسا کرتا ہے؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو محض یہ کہہ دینا کہ وہ ایسا کردے گا درست نہیں۔ وہ اپنے قانون کو تمہارے لیے کیوں توڑے گا۔ اس کا یہ قانون ہے کہ اگر اس کا کسی سے وعدہ ہے تو وہ قربانی کرے اور اس کے لیے جدوجہد کرے تو وہ اس کی مدد کرے گا اور وہ کامیاب ہو جائے گا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں یا کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے۔ جو ایسا کرتے ہیں خدا تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کو وہ مرتد اور بے ایمان بنا دیتا ہے۔ اُن کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

پس ہماری جماعت کو اپنے اندر یہ احساس پیدا کر لینا چاہیے کہ ہم اس چیز کی امید نہیں رکھ سکتے جو پہلے نبیوں کے ساتھ نہیں ہوئی۔ پہلے انبیاء کی جماعتوں کو قربانیاں کرنی پڑیں۔ پہلے انبیاء کے ماننے والے اپنے ملک اور قوم میں مجنون کہلاتے تھے۔ قرآن کریم اِس قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ پس جب تک ہم پہلی جماعتوں کی طرح قربانیاں نہیں کرتے، پہلی جماعتوں کی طرح جب تک ہم مجنون نہیں کہلاتے ہم کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے گھر جاتے ہوئے اپنی حفاظت کے لیے اِدھر اُدھر نظر مارتے جاتے ہیں اور ڈر کی وجہ سے تبلیغ نہیں کرتے، دین کی خدمت کی طرف توجہ نہیں کرتے تو تم مجنون نہیں کہلا سکتے۔ مجنون کے تو معنے ہی یہ ہیں کہ وہ اپنی عاقبت کی پروا نہیں کرتا۔ پھر بعض لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اِس طرح نوکریاں جاتی رہیں گی، تجارتیں ضائع ہو جائیں گی اور پھر

جماعت کے پاس روپیہ کم ہو جائے گا، جماعت کے اخراجات کیسے چلیں گے؟ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم مال کے ذریعہ دنیا کے مقابلہ میں جیت نہیں سکتے۔ امریکہ کا ایک مالدار ہماری جماعت کی تمام جائیدادیں خرید سکتا ہے اور پھر بھی اُس کے خزانے میں روپیہ رہتا ہے۔ امریکہ کے بعض مالداروں کے پاس ہماری ساری جماعت سے زیادہ روپیہ ہے۔ بعض کے پاس تو بیس بیس ارب روپیہ ہے اور اتنا روپیہ ہماری ساری جماعت کے پاس نہیں۔ ان میں ایسے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن کے پاس اربوں روپیہ ہے۔ وہ لوگ ڈالروں میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ فلاں کے پاس ہزار ملین ہیں، فلاں کے پاس دو ہزار، فلاں کے پاس تین، چار یا پانچ ہزار ملین ڈالر ہے اور یہ تین ارب روپیہ سے لے کر پندرہ ارب روپیہ تک ہو جاتا ہے۔ ایسی قوم کا مقابلہ تم دولت سے کس طرح کر سکتے ہو۔ پھر ہمارے پاس دنیاوی طاقت بھی نہیں۔ پیشوں کو لے لو، تجارت کو لے لو، تعلیم کو لے لو، صنعت وحرفت کو لے لو، کسی چیز میں بھی تو ہم غالب نہیں آ سکتے۔ پس اگر ہم دنیوی لحاظ سے دیکھیں تو سیدھی بات ہے کہ ہم دوسری قوموں پر غالب نہیں آ سکتے۔ اگر ہم غالب آ سکتے ہیں تو محض اِس طرح سے کہ ہم دین کو دنیا پر مقدم کر کے اپنے آپ کو پاگل بنا دیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو پاگل بنا دیں تو ایک سال میں ہم وہ کام کر لیں جس سے دنیا کی کایا ہی پلٹ جائے۔ مَیں نے جماعت کو کئی بار توجہ دلائی ہے کہ ہر احمدی سال میں کم از کم ایک احمدی بنائے اور مَیں نے حساب لگا کر بھی بتایا تھا کہ اس طرح ہم دس پندرہ سال میں کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے۔ اگر ہر احمدی سال میں ایک ایک احمدی بنائے تو اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم اِس وقت ہندوستان میں تین لاکھ ہیں۔ ایک سال کے بعد ہم چھ لاکھ ہو جائیں گے۔ دو سال کے بعد بارہ لاکھ ہو جائیں گے، تین سال کے بعد چوبیس لاکھ ہو جائیں گے، چار سال کے بعد اڑتالیس لاکھ ہو جائیں گے، پانچ سال کے بعد چھیانوے لاکھ ہو جائیں گے، چھ سال کے بعد ایک کروڑ بانویں لاکھ ہو جائیں گے، سات سال کے بعد تین کروڑ چوراسی لاکھ ہو جائیں گے، آٹھ سال کے بعد سات کروڑ اڑسٹھ لاکھ ہو جائیں گے، نو سال کے بعد پندرہ کروڑ چھتیس لاکھ ہو جائیں گے، دس سال کے بعد تیس کروڑ بہتّر لاکھ ہو جائیں گے۔ تو دیکھو اگر ہر ایک احمدی سال میں ایک ایک احمدی بنائے تو دس سال میں کتنا بڑا تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ ہم ایسا کرتے ہیں یا نہیں؟ سال میں ایک احمدی بنانا کوئی مشکل چیز نہیں۔

بشرطیکہ کوئی عقل سے کام لے اور اپنے اوپر جنون وارد کرے۔ لیکن اصل میں یہ رسمی طور پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوست پسند آ گیا اور اُس سے کوئی بات کہہ دی تو سمجھ لیا کہ اس نے سلسلہ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ درحقیقت دوست بنانا مقصود ہوتا ہے تبلیغ کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ تعیّش کے لیے کوئی بامذاق آدمی مل جائے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ سلسلہ پر وہ احسان کر رہا ہے حالانکہ وہ شخص بعض اوقات اِس قابل بھی نہیں ہوتا کہ اُسے تبلیغ کی جائے اور بسا اوقات تبلیغ کی بھی نہیں جاتی۔ کسی وقت وہ اگر اِتنی سی بات کہہ دیتا ہے کہ فلاں ملک میں ہمارے فلاں مبلغ نے تبلیغ کی تو وہ دوست کہہ دیتا ہے واہ واہ سُبْحَانَ اللّٰہِ ۔ یہ تو بہت ہی اچھا کام ہے اور وہ احمدی سمجھ لیتا ہے کہ آج وہ آدھا احمدی ہو گیا ہے۔ پھر کسی دن یہ کہہ دیا کہ ہم نے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کی ہے تو وہ دوست کہہ دیتا ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ بہت اچھا کام ہے۔ وہ احمدی اِس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ وہ آج تین چوتھائی احمدی ہو گیا ہے۔ غرض اگر کوئی اِتنی تعریف بھی کر دے جتنی کوئی ایک گاجر کے ٹکڑے پر تعریف کر دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ آخر آپ کو دنیا کے کاموں سے اتنی محبت کیوں ہے؟ دین کی خاطر تو اِتنا وقت بھی خرچ نہیں کیا جاتا جتنا وقت کسی کی بیوی یا خادمہ روٹی پکانے میں خرچ کر دیتی ہے۔ پھر یہ کیا بیہودگی اور مداہنت ہے کہ آپ تبلیغ پر اُتنا وقت بھی نہیں لگاتے جتنا وقت روٹی پکانے پر لگ جاتا ہے اور پھر سمجھتے ہیں کہ ہم قربانی کرتے ہیں۔

میں آپ لوگوں کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں کہ خدائی بادشاہت کا وقت قریب آ رہا ہے اور جب خدائی بادشاہت کا وقت آتا ہے تو کمزور ایمان اور منافق لوگ کفار سے زیادہ مرتے ہیں۔ جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو لوگ ایک بزرگ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ آپ دعا کریں کہ خدا تعالیٰ ہلاکو خان سے ہمیں محفوظ رکھے۔ اُس بزرگ نے کہا میں کیا دعا کروں میں دیکھتا ہوں کہ آسمان پر سب فرشتے یہ دعا کر رہے ہیں اَیُّھَا الْکُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ اَیُّھَا الْکُفَّارُ اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ یعنی اے کافرو! فاجروں کو قتل کرو، اے کافرو! فاجروں کو قتل کرو جہاں اِتنا فرشتہ یہ دعا کر رہا ہے وہاں میری دعائیں کیا کریں گی۔ پس جب خدائی بادشاہت کا وقت آتا ہے تو اس قسم کے لوگ مجرموں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور کسی قسم کے انعام کے مستحق نہیں ہوتے۔ جب خدائی بادشاہت قائم ہو جائے پھر اِس قسم کے لوگ بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد تنزل کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور جب تنزل کا

وقت آتا ہے تو منافق بھی دولت سے حصہ لے لیتے ہیں۔ جب مسلمانوں کی بادشاہت آئی تو جعفر برمکی جیسے تو وزیر بن گئے لیکن سید عبدالقادر صاحب جیلانی جیسے بزرگ تو گوشہ نشین ہی تھے۔ پس دنیوی اقتدار کے وقت میں تو منافق کامیاب ہو جاتے ہیں مگر ابتدائی زمانہ میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ بادشاہتوں کے بعد تو اکثر دولت منافق لے جاتے ہیں۔ بنوامیہ کے بادشاہوں کو لے لو وہ منافق ہی تھے جو دنیا کو لُوٹتے تھے، فسق و فجور میں مبتلا تھے، رشوتیں لیتے تھے، خیانتیں کرتے تھے مگر جو نیک تھے وہ گوشہ نشین ہی تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُبی بن سلول کو تو خلافت نہیں ملی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ کا سلوک ابتدائی زمانہ میں اَور ہوتا ہے اور ترقی کے زمانہ میں اَور ہوتا ہے۔ اُس وقت دین غالب ہو جاتا ہے اور اُس کے غلبہ کے لیے دنیاوی اقتدار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اِس لیے اگر اُس وقت منافق دولت میں سے حصہ لے لیتے ہیں تو خدا تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن جب ابتدائی زمانہ ہوتا ہے جب دین کے غلبہ کے لیے دنیوی اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے اُس وقت دنیوی اقتدار میں سے حصہ اُس کو ملتا ہے جو مخلص اور مومن ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خلیفہ ہم بناتے ہیں کیونکہ ابتدائی زمانہ میں خلیفہ وہی ہونا چاہیے جو خدا تعالیٰ کے منشا کو جاری کرے۔ لیکن جب خدا تعالیٰ کی بادشاہت قائم ہو جاتی ہے تو پھر یزید جیسے بھی بادشاہ بن جاتے ہیں۔ ہزاروں ہزار ایسے فاسق ہوتے ہیں جو بادشاہ بن جاتے ہیں مگر اولیاء اللہ کو بعض اوقات روٹی بھی نہیں ملتی۔ دہلی کے تخت پر جب مسلمان بادشاہ متمکن تھے سید ولی اللہ شاہ صاحب جیسے بزرگ کپڑے کو بھی ترستے تھے۔ آپ کو صفائی کا بہت شوق تھا اور روز کپڑے دھلوا کر بدلتے تھے۔ آپ کی دنیوی حالت بادشاہوں کے نوکروں جیسی بھی نہیں تھی۔ پس جب دنیوی اقتدار حاصل ہوتا ہے اُس وقت یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اُس میں نیکوں کو ہی حصہ ملے۔ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ اُس وقت ختم ہو جاتا ہے۔

پس جماعت کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ جب بھی دنیا میں کوئی مامور آتا ہے تو ابتدائی زمانہ میں اُس کے ماننے والوں میں سے ہر ایک دین کا سپاہی ہوتا ہے جو اپنی جان دین کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا بدلہ کیا ملتا ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ ایک غریب آدمی تھے۔ اُن کے بھائی میں بھی اِتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائی کو جو دین کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا کھانا دے سکے لیکن ابو ہریرہؓ کو صرف ابو ہریرہ ہی نہیں کہتے بلکہ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی جب آپ کا

نام لے گا تو ساتھ رضی اللہ عنہ کہے گا۔ ایک مزدور چکی پیسنے والے، گدھے چلانے والے اور اونٹ لادنے والے صحابی کا بھی آج جب نام لیا جاتا ہے تو ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ لیکن بڑے سے بڑے بادشاہ کا جب نام لیا جاتا ہے تو کوئی اُسے رضی اللہ عنہ نہیں کہتا۔ اکبر جو بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے اُس کے نام کے ساتھ کوئی رضی اللہ عنہ نہیں کہتا مگر حضرت ابوہریرہ کا جب بھی نام لیا جاتا ہے تو ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ وہ ابوہریرہ جس کو سات سات وقت کا فاقہ ہو جاتا تھا، جس کی بعض دفعہ بھوک کی وجہ سے ایسی حالت ہو جاتی تھی کہ مرگی کا دَورہ سمجھ کر آپ کو لوگ جُوتیاں مارا کرتے تھے۔4 وہ تو رضی اللہ عنہ کہلاتا ہے مگر اکبر، بابر، ہمایوں، شاہجہان، عالمگیر، تیمور وغیرہ بادشاہوں کا نام جب لیا جاتا ہے تو اُن کے ساتھ کوئی بھی رضی اللہ عنہ نہیں کہتا۔ یہ ان صحابہ کی قربانیوں کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں کی تھیں۔ انہوں نے دنیا کو اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ نے انہیں بادشاہ کر دیا۔ اب بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اُن کی برتری کا اقرار کرتا ہے۔ ہر زمانہ کے لیے الگ الگ انعام اور ذمہ داریاں ہیں۔ ہم اِس وقت کی ابتدائی جماعت ہیں ہماری حالت بالکل الگ ہے۔ بعد میں زمانہ اَور تقاضا کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں اگر کوئی نمازیں پڑھ لے یا چندہ دے دے تو خدا تعالیٰ اُسے بڑا بزرگ سمجھ لے لیکن جب تک ہم تلوار کی دھار کے نیچے اپنی گردنوں کو نہیں رکھتے، جب تک آروں کے نیچے آ کر ہم نہیں چیرے جاتے ہم اس انعام کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ جماعت کے ہر آدمی پر ایک جنون سا ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ جو بوجھ خدا تعالیٰ نے اس کے کندھوں پر ڈالا ہے وہ اسے پورا کرے"۔ (الفضل 18 ستمبر 1948ء)

1: البقرہ: 151

2: المائدہ: 25

3: الصف: 10

4: بخاری کتاب الاعتصام باب ذکر النبی وحضّ علی اتفاق (مفہوماً)